فصل یازدہم

(۱)

سلمان لگ بھگ ڈیڑھ مہینے تک اسپتال میں رہا۔ اس کے جسم پر تیرہ زخم آئے تھے۔ تین روز تک وہ ایمرجنسی وارڈ میں بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو اس کی بینائی بہت دھندلی تھی۔ نقاہت اس قدر زیادہ تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ پہلو میں تیسری پسلی کے نیچے ایسا گہرا زخم تھا جس نے کئی روز تک ڈاکٹروں کو پریشان رکھا۔

شروع شروع میں اسکائی لارک اسپتال میں اس کی عیادت کے لیے آتے رہے۔ مگر رفتہ رفتہ انہوں نے آنا جانا بالکل چھوڑ دیا ان کا یہ رویہ سلمان کو بہت شاق گزرا۔ اسے اسکائی لارکوں کی اس بے اعتنائی پر غصہ آیا اور اپنی بیکسی پر دکھ بھی ہوا۔

اسپتال سے صحت یاب ہو کر جب وہ ہیڈ کوارٹر پہنچا تو بہت جھنجلایا ہوا تھا۔ راستے بھر سوچتا رہا کہ فلک پیما کے آئندہ اجلاس میں وہ اسکائی لارکوں کی اس بے رخی کے خلاف شدید احتجاج کرے گا اور یہ دریافت کرے گا کہ اس کے ساتھ ایسا ناروا سلوک کیوں اختیار کیا گیا؟

لیکن گمٹی پہنچ کر اس نے ہیڈ کوارٹر دیکھا تو سب کچھ بھول گیا۔ ہیڈ کوارٹر کی دیواریں ابھی تک جھلسی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ہر چند کہ جلے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ نئی کھڑکیاں اور دروازے لگا دیے گئے تھے مگر آتشزدگی کے نشانات جگہ جگہ دھوئیں کے سیاہ دھبے بن کر بکھرے ہوئے تھے۔ لائبریری کی ایک دیوار چٹخ گئی تھی۔ اس میں انچ بھر چوڑا نشان تھا۔

نقاہت: کمزوری۔ عیادت: تیمارداری۔ شاق: ناگوار۔ بے اعتنائی: لاپروائی۔

سلمان جس وقت وہاں پہنچا دن ڈھل چکا تھا۔ شام کے امنڈتے اور پھیلتے ہوئے دھندلکے میں
ہاڑی عمارت کسی کھنڈر کی طرح ویران نظر آ رہی تھی۔
سلمان نے اندر داخل ہو کر دیکھا، کمروں میں گہرا سناٹا تھا۔ نہ پہلی سی چہل پہل تھی نہ اسکائی
ں کی مصروف اور سرگرم زندگی کی گہما گہمی تھی۔ ہر طرف بوجھل خاموشی چھائی تھی۔ وہ
راں سے گزرتا ہوا دفتر کی جانب بڑھا۔
دفتر کا دروازہ کھلا تھا کمرے میں دن کی ڈوبتی ہوئی روشنی مدہم پڑ چکی تھی۔ اس نیم تاریکی میں
نحیف و لاغر شخص میز پر جھکا سامنے رکھے ہوئے کاغذات دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے قریب
ر دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ یہ ڈاکٹر زیدی تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں بال کنپٹیوں پر
سفید ہو گئے تھے۔ وہ خاصا بوڑھا نظر آ رہا تھا۔
سلمان کے دل کو سخت دھچکا لگا وہ دروازے پر ٹھٹک کر رہ گیا۔ غور سے دیکھنے لگا کہ آیا وہ ڈاکٹر
زیدی ہے یا کوئی اور۔ واقعی وہ اب بہت تبدیل ہو گیا تھا۔ اچانک ڈاکٹر نے گردن اٹھا کر سلمان کی
طرف دیکھا اور حیرت سے چیختا ہوا کھڑا ہو گیا۔
"ہیلو سلمان!"
سلمان گرم جوشی سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔ "ڈاکٹر تم نے اپنا یہ کیا حلیہ بنا لیا؟"
ڈاکٹر زیدی صرف مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ بڑی پژمردہ تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے
سلمان کے اس سوال سے اسے ذہنی اذیت پہنچی ہے۔ سلمان نے خاموشی اختیار کر لی۔ مزید بات
نہ چھیڑی۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں اب خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے اٹھ کر
روشنی کیا۔
سلمان نے پوچھا۔ "دوسرے اسکائی لارک کہاں ہیں؟"
"اپنے اپنے حلقوں میں کام کرنے گئے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔"
ڈاکٹر زیدی کے جواب سے سلمان کو بڑی ڈھارس ہوئی۔ اس کے بعد باتوں کا طویل سلسلہ
چل نکلا۔
ڈاکٹر زیدی نے بتایا کہ صفدر بشیر حملے کی رات ہی کو جاں بحق ہو گیا تھا۔ اس کے جسم پر زخموں

لعلاً: بہت زیادہ کمزور۔ ششدر: حیران۔ پژمردہ: افسردہ، مرجھائی ہوئی۔

کے ۴۲ نشانات تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے اسکائی لارک بھی زخمی ہوئے تھے۔ صرف فہیم اللہ
اسکائی لارکوں کے ساتھ پچھلی دیوار پھاند کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

پولیس موقع واردات پر اس وقت پہنچی جب حملہ آور فرار ہو چکے تھے۔ حالانکہ فہیم اللہ
ہیڈ کوارٹر سے نکلتے ہی پہلا کام یہ کیا تھا کہ پولیس کو حملے کی اطلاع کر دی تھی۔ پولیس کی تفتیش شروع
ہونے کے چند ہی روز بعد قریب قریب سارے اسکائی لارک گرفتار کر لیے گئے۔ ہیڈ کوارٹر کی
تلاشی لی گئی اور تمام کاغذات پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیے۔

اسکائی لارکوں پر صفدر بشیر کے قتل کے الزام میں مقدمہ قائم کیا گیا۔ پولیس کی رپورٹ کے
مطابق الزام کی نوعیت یہ تھی کہ صفدر بشیر فلک پیما سے مستعفی ہو چکا تھا۔ وہ لندن جانے والا تھا
واردات کی شب وہ ہیڈ کوارٹر آیا تھا اور فلک پیما کے فنڈ میں اس کی جو رقم موجود تھی، اس کی واپسی
مطالبہ کر رہا تھا۔ مگر رقم دینے سے انکار کر دیا گیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ اسکائی لارکوں نے یہ ثابت
کرنے کے لیے کہ صفدر بشیر اپنے حامیوں کے ساتھ حملہ کرنے کی نیت سے آیا تھا، ہیڈ کوارٹر کی
عمارت کو آگ لگا دی۔

پولیس کے موقف کی تائید علیم احمد نے کی۔ بعد میں فہیم اللہ بھی سرکاری گواہ بن گیا۔ ان
دونوں کے علاوہ پولیس بستی سے بھی چند گواہ مہیا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔

مقدمے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ پولنگ سے قبل کسی اسکائی لارک کی ضمانت نہ
ہو سکی۔ ووٹنگ کے وقت پولنگ اسٹیشن پر اسکائی لارکوں کا نہ کوئی ایجنٹ موجود تھا اور نہ ہی ووٹوں کی
گنتی کے وقت کوئی نمائندہ تھا۔

ڈاکٹر زیدی امیدوار تھا۔ مگر دوسرے اسکائی لارکوں کے ساتھ وہ بھی جیل میں بند تھا۔
انتخابات کے نتائج کا اعلان ہوا تو اس کے ووٹ تعداد میں اس قدر کم نکلے کہ ضمانت بھی ضبط ہو گئی۔
خان بہادر فرزند علی بھاری اکثریت سے میونسپل بورڈ کا ممبر منتخب ہو گیا۔ اس شاندار کامیابی پر اس کے
دھوم دھام سے جلوس نکلا۔ بستی میں جگہ جگہ مٹھائی تقسیم ہوئی۔ اس کے کارکنوں نے اپنے گھروں
پر چراغاں کیا۔

خان بہادر فرزند علی کی کامیابی کے چند ہی روز بعد اسکائی لارکوں کی ضمانتیں منظور ہونا شروع
ہو گئیں۔ علی احمد بھی ضمانت پر رہا ہو چکا تھا۔ البتہ ریاض سیفٹی ایکٹ کے تحت ہنوز نظر بند تھا۔ بعض

لارک رہائی کے بعد اس قدر دہشت زدہ اور ہراساں ہوگئے کہ انہوں نے فلک پیما سے کنارہ
ار کرلی۔ اب صرف سنات اسکائی لارک رہ گئے تھے۔ اس افراتفری میں تمام محاذوں پر کام بند
ا۔ انڈسٹریل ہوم پر کسی نے زبردستی قبضہ کرلیا۔ تعلیم بالغاں کے تمام مراکز بند ہوگئے۔
طالع میں ایک تانگے والے نے اپنا گھوڑا باندھنا شروع کردیا اور اسے باقاعدہ اصطبل بنادیا۔
کانفرنس ضبط کرلیا گیا تھا اور ہیڈ کوارٹر کی عمارت سربہ مہر کردی گئی تھی۔
رہائی کے بعد اسکائی لارکوں کے سامنے طرح طرح کی مشکلات تھیں جن پر قابو پانے کے
نہایت سرگرمی سے جدوجہد کی جارہی تھی۔ تحریک کو زندہ رکھنے کے واسطے از سر نو سازگار فضا
ہموار کی جارہی تھی۔
ڈاکٹر زیدی دیر تک سلمان کو بیتی باتیں سناتا رہا۔
سلمان نے یہ حالات سنے تو غم و غصے سے تڑپ کر بولا۔ "یہ ساری مصیبتیں خان بہادر کی لائی
ہوئی ہیں۔ بڑا کمینہ اور بے رحم شخص ہے۔"
ڈاکٹر زیدی نے کہا۔ "اقتدار کی ہوس انسان کو اندھا اور خود غرض بنادیتی ہے۔"
"نعیم اللہ اور علیم احمد سے بھی کبھی ملاقات ہوئی؟"
"نہیں!" ڈاکٹر نے لمحہ بھر رک کر کہا۔ "خان بہادر نے دونوں کو میونسپلٹی میں ملازمت دلوادی
ہے تنخواہ تو زیادہ نہیں مگر بالائی آمدنی بہت اچھی ہے۔ بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے ہیں۔"
تھوڑی دیر بعد علی احمد آگیا۔
اس کے ہمراہ دو نوجوان اسکائی لارک بھی تھے۔ علی احمد نے سلمان کو دیکھا تو گرم جوشی سے
گلے لگالیا۔ ہنس کر بولا۔
"میں تو سمجھا تھا کہ جس طرح اور اسکائی لارک ہمارا ساتھ چھوڑ گئے تم نے بھی منہ موڑ لیا۔"
سلمان نے تیکھے لہجے میں جواب دیا۔ "میں آج ہی تو اسپتال سے نکلا ہوں۔ آپ لوگوں نے
کبھی نہیں پوچھا کہ کس حال میں رہا۔ زندہ بچا کہ مر گیا۔"
علی احمد معذرت کرتے ہوئے بولا۔ "بھئی معاف کرنا۔ کچھ عرصہ تو جیل میں گزرا۔ رہائی ملی
تو افراتفری کا زمانہ گزرا کہ کسی کو ایک دوسرے کا ہوش نہ رہا۔ تمہاری شکایت بالکل درست

ف ۱ سے۔ بالائی آمدنی: مراد رشوت، ناجائز کمائی۔

ہے۔ مجھے اس کا بیحد افسوس ہے۔"

سلمان نے مزید کچھ نہ کہا۔ علی احمد اسے اسکائی لارکوں کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ آٹھ بجے تک سارے سکائی لارک دفتر میں اکٹھا ہو گئے۔ ہر ایک نے بڑے جوش و خروش سے سلمان کا خیر مقدم کیا۔ سب اس کی آمد سے بہت خوش تھے۔ ان میں نئی توانائی اور مستعدی نظر آ رہی تھی۔

اس روز سب نے مل کر ایک ساتھ کھانا کھایا۔ دس بجے کے قریب فلک پیما کا اجلاس ہوا جس میں صورت حال کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا اور اس کی روشنی میں آئندہ کے لیے لائحہ عمل تیار کیا گیا۔ نئے عزائم اور تازہ ولولے کے ساتھ جدوجہد کرنے کا عہد کیا گیا۔ اجلاس آدھی رات تک جاری رہا۔ ہر مسئلے پر بحث ہوئی اور ہر اسکائی لارک نے بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

نئی تجاویز پیش کی گئیں۔ سب سے زیادہ اس تجویز پر زور دیا گیا کہ فلک پیما کے لئے کار فراہم بنائے جائیں۔ مگر علی احمد نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ اس لیے کہ فلک پیما کے پاس اب بہت قلیل فنڈ تھا۔ وہ بھی علی احمد نے بارہ ہزار روپے میں اپنا مکان فروخت کر کے مہیا کیا تھا۔ اور جس کا بڑا حصہ مقدمے بازی میں اور ضروری اشیاء کی خریداری پر خرچ ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں بعض اسکائی لارکوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ فلک پیما کے ہمدردوں سے چندہ لیا جائے۔ سلمان کی رائے تھی کہ تعلیم بالغاں کے مرکزوں میں پڑھنے والے طلبا سے فیس لی جائے جو بہت معمولی ہو۔ ڈاکٹر زیدی نے اس کی تائید کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ ڈسپنسری سے جو دوائیں دی جاتی ہیں مریضوں سے ان کی کچھ نہ کچھ قیمت لی جائے۔ کم سے کم ان لوگوں سے جو قیمت دے سکتے ہیں۔ لیکن اس روز کوئی تجویز منظور نہیں کی گئی اور فنڈ کا مسئلہ آئندہ اجلاس تک ملتوی کر دیا گیا۔

ڈاکٹر زیدی نے سلمان کو مشورہ دیا کہ وہ کچھ دن آرام کرے۔ اس کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ کوئی کام کر سکے۔ مگر اس نے ڈاکٹر کی ایک نہ سنی۔ دوسرے ہی روز اپنے پرانے شاگردوں سے ملا۔ جس جگہ تعلیم بالغاں کا مرکز تھا، وہ جگہ دیکھی۔ وہاں ایک قصائی نے گوشت کی دکان کھول رکھی تھی۔ اس کا گھر بھی قریب ہی تھا۔ سلمان اس سے ملا اور یہ تجویز پیش کی کہ دکان کہیں اور لے جائے۔ مگر وہ سرکش آدمی تھا۔ اس نے نہ صرف سلمان کی تجویز مسترد کر دی بلکہ اس قدر خفا ہوا کہ گالی گلوچ پر اتر آیا۔ سلمان کے ساتھ جو لوگ تھے ان کو بھی غصہ آ گیا۔ اچھی خاصی لڑائی جھگڑے کی فضا پیدا ہو گئی۔

سلمان نے بات آگے نہ بڑھنے دی۔ یہ طے کیا کہ مرکز کسی اور جگہ قائم کر لیا جائے۔ کہیں جگہ ملے تو فوری طور پر کسی کھلی جگہ چٹائیاں بچھا کر اور گیس بتی روشن کر کے کلاسیں شروع کر دی جائیں۔

شام کو سلمان وہاں پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ ایک مکان کی دیوار کے سہارے پرانے ٹین کے ڈبوں کا سائبان ڈال دیا گیا تھا۔ گیس بتی روشن تھی اور فرش پر چٹائیاں بچھی تھیں۔ اسے بڑی خوشی ہوئی اور وہ دن یاد آ گیا جب فلک پیما نے تعلیم بالغاں کا پہلا مرکز قائم کیا تھا۔

چند ہی روز میں طلباء کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مجبوراً داخلہ بند کرنا پڑا۔ جب مرکز اچھی طرح چلنے لگا تو سلمان نے اس کی ذمہ داری ایک تربیت یافتہ اسکائی لارک کے سپرد کی اور خود دوسرا مرکز قائم کرنے میں مصروف ہو گیا۔

اگلے جھگ مہینہ بھر میں سلمان نے دوڑ دھوپ کر کے تعلیم بالغاں کے تین مرکز قائم کر دیے۔ ان میں باقاعدہ تعلیم بھی شروع ہو گئی۔

علی احمد کو سلمان کے واپس آنے سے بڑی مدد ملی۔ اب ہر کام معمول پر آتا جا رہا تھا۔ ٹرینل ہوم کو اسکائی لارکوں نے اپنی نگرانی میں لے کر از سر نو منظم کرنا شروع کر دیا تھا۔ کارخانے پھر سے قائم کر دیے گئے۔ ڈسپنسری کو بھی درست کیا گیا۔ مگر سب سے بڑی دقت فنڈ کی تھی جس کے بغیر کام چلانا بہت مشکل تھا۔

اسکائی لارک ابھی تک یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ فنڈ کس طرح مہیا کیا جائے۔ فنڈ کی قلت کے باعث اسکائی لارکوں نے ایک وقت کا کھانا بند کر دیا تھا۔ اپنی تمام ضروریات کم سے کم کر دی تھیں۔ سگرٹوں کے بجائے انہوں نے بیڑیاں پینا شروع کر دی تھیں۔ جن کے کپڑے پھٹ گئے تھے دوسرے اسکائی لارکوں کے کپڑوں سے کسی نہ کسی طور پر اپنا کام چلا رہے تھے۔

سلمان کی صحت اسپتال سے نکلنے کے بعد پہلے ہی خراب تھی۔ سخت مشقت اور مناسب غذا نہ ملنے کے باعث اس کا جسم اور لاغر ہو گیا۔ چہرے کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ آنکھیں اندر دھنس گئی تھیں۔ سر کے خشک بال تنکوں کی طرح کھڑے رہتے۔ اس کے چہرے پر ویرانی برسنے لگی تھی۔ مگر وہ اپنی طرف سے بے نیاز کام کرنے کی دھن میں مگن تھا۔

ایک شام کو سلمان شہر کے بڑے بازار سے گزر رہا تھا۔ اچانک نیاز سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ نیاز کے ساتھ سلطانہ بھی تھی۔ وہ اس وقت خاصی ماڈرن اور طرح دار لگ رہی تھی۔ جدید طرز کا ریشمی لباس اور ہلکا ہلکا میک اپ۔ وہ کسی شہزادی کی طرح نظر آ رہی تھی۔ دونوں ایک دکان سے نکل کر باہر آ رہے تھے۔ سلمان نے چاہا کہ ان کی نظریں بچا کر نکل جائے مگر نیاز نے اسے دیکھ لیا۔ بے تکلفی سے بولا۔

"ہیلو سلمان!"

مجبوراً اسے رکنا پڑا۔ نیاز اس کے قریب آ کر بولا۔ "ارے بھئی! کہاں ہو۔ کہیں نظر نہیں آتے؟"

سلمان نے جواب دیا۔ "میں تو یہیں تھا۔"

"مگر تم نے یہ اپنا کیا حلیہ بنا لیا ہے؟"

سلمان اس کی بات سن کر قدرے گھبرا گیا۔ واقعی اس کا عجیب حلیہ تھا۔ خشک بال، بڑھا ہوا شیو، چہرے پر گرد۔ لباس گندہ جس کی ایک آستین اس طرح پھٹ گئی تھی کہ اندر کی جلد صاف نظر آتی تھی۔ اور نیاز ایسا لگتا تھا جیسے کسی لانڈری سے ابھی دھل دھلا کر نکلا ہے۔ شارک اسکن کی جھلکتی ہوئی سفید بش شرٹ اور کارڈرائی کی پتلون میں وہ خاصہ اسمارٹ لگ رہا تھا۔ چہرے کی رنگت نکھر گئی تھی۔ رخساروں پر ہلکی ہلکی سرخی تھی۔ آنکھیں شفاف تھیں۔ سلطانہ کے ہمراہ کسی طرح بھی ناموزوں نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ سلمان نے اس کے روبرو خود کو کوڑے کے ڈھیر سے نکلے ہوئے مریل چوہے کی طرح حقیر محسوس کیا۔

نیاز بولا۔ "کہیں نوکری وکری بھی ملی یا ابھی تک بے روزگاری کا چکر چل رہا ہے۔"

"نوکری کا ارادہ تو مدت ہوئی میں نے ترک کر دیا۔"

"تو پھر کیسے کام چل رہا ہے؟" نیاز نے سلمان سے پوچھا۔

"کچھ سوشل کام کر رہا ہوں آج کل۔"

نیاز ہنسنے لگا۔ "ارے بھئی، اس سوشل کام وام کے چکر میں کہاں پڑے ہو۔ ذرا اپنی حالت تو

ں میں پہلے تو تمہیں پہچان ہی نہ سکا۔"

سلمان اس کی باتوں سے پریشان ہو گیا، کہنے لگا۔ "بیمار تھا۔"

نیاز بڑے سرپرستانہ انداز میں بولا۔ "بھئی لیڈری ویڈری تم کو زیب نہیں دیتی۔ یہ تو بڑے وں کے چونچلے ہیں۔ میرا کہا مانو تو اس جھنجھٹ پر لعنت بھیجو۔ کل کسی وقت آ کر مجھ سے ملو۔ تمہارے لیے نوکری کا بندوبست کرا دونگا۔ میرا دفتر پاور ہاؤس کے برابر والی سڑک پر ہے۔ وہاں کر جس کسی سے پوچھو گے دفتر کا پتہ بتا دے گا۔ میں عام طور پر نو بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں اور دو بجے ضرور رہتا ہوں۔ لو یہ میرا کارڈ رکھ لو۔" اس نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر سلمان کو دیا۔

سلمان اس کی باتوں پر سخت جھنجلایا۔ دل ہی دل میں کہا یہ سالا کباڑیا خود کو کیا سمجھنے لگا ہے۔ نہ نے کیا چار سو بیس کر کے کچھ رقم پیدا کر لی۔ اب اس طرح بات کر رہا ہے جیسے دولت کے ساتھ ل عقل بھی بڑی ہو گئی۔ اس نے کسی قدر بے رخی کا مظاہرہ کیا۔

"آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ۔ فی الحال مجھے ملازمت کی ضرورت نہیں۔ اگر کبھی ایسا ام ہوا تو آپ سے ضرور ملوں گا۔"

سلمان نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر بیڑی کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی ہونٹوں سے لگا کر نے ہی والا تھا کہ نیاز نے اپنا سنہری سگریٹ کیس کھولا اور سلمان کے سامنے کرتے ہوئے بولا۔

"لو یہ ۵۵۵ پیو۔"

"شکریہ۔ میں بیڑی پیوں گا۔"

نیاز بے تکلفی سے بولا۔ "اماں اس خواہ مخواہ کے تکلف میں کیا رکھا ہے۔ اچھی چیزیں استعمال و تو باتیں بھی اچھی ہی اچھی سوجھتی ہیں۔"

اسی وقت سلطانہ نے بیزاری سے کہا۔ "چلئے دیر ہو رہی ہے۔"

نیاز نے پلٹ کر سلطانہ کی جانب دیکھا۔ مسکرا کر بولا۔ "یہ مسٹر سلمان ہیں۔ میرے پرانے سلے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ لیڈری کے چکر میں پڑ کر اپنی یہ حالت بنالی۔" وہ سلمان کی سے صفائی پیش کرنے لگا۔ مگر سلطانہ نے سلمان کا ذرا بھی نوٹس نہ لیا۔ بے نیازی سے اپنے لچے کا رخ ناخون دیکھتی رہی۔

سے نوٹس لینا: توجہ کرنا۔

سلمان کے لیے ایک ایک لمحہ دوبھر ہو رہا تھا۔ وہ شدید ذہنی کرب میں مبتلا تھا۔ گھبرا کر سے بولا۔ "اب میں چلوں گا۔ مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔"

"اچھا، اچھا! جی چاہے تو کبھی دفتر کی طرف چلے آنا۔" یہ کہتا ہوا نیاز آگے بڑھ گیا۔

سلطانہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اس کی خوبصورت صراحی دار گردن اٹھی ہوئی تھی۔ چال میں تمکنت تھی۔ دونوں قریب کھڑی ہوئی کار میں بیٹھ گئے۔ کار نیاز ڈرا رہا تھا۔ سلطانہ اس کے برابر ہی بیٹھی تھی۔ سلمان چپ چاپ کھڑا ان کو دیکھتا رہا۔ اسے گمان سلطانہ ایک بار اس کی جانب ضرور دیکھے گی۔ مگر سلطانہ نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔ بڑے لاڈ کے شانے پر جھک کر اس کے کان میں آہستہ سے کچھ کہا۔ دونوں مسکرا دیے۔

کار اسٹارٹ ہوئی اور سڑک پر دوڑنے لگی۔ سلمان دور تک اسے خوابناک نظروں سے رہا اس نے آگے بڑھتے ہوئے سوچا۔ سلمان! سلطانہ اب بہت دور جا چکی ہے اور تم دلدل پڑے ہو اور اس دلدل میں گرنا تم نے خوشی سے منظور کیا ہے۔ اس لیے کہ تم معاشرے سے غلا صاف کر دینا چاہتے ہو۔ تمہیں حسین چیزوں کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ خواہ وہ سلطانہ چودھویں کا چاند۔ تم تو خوبصورتی کے حصول کے بجائے بد صورتی کو حسن میں ڈھالنے کے جدوجہد کرتے ہو۔

سلمان نے کسی نہ کسی طرح اپنے دل کو سمجھا تو لیا مگر وہ یہ نہ بھول سکا کہ اس کی زندگی ایک لڑکی سلطانہ بھی آئی تھی جس نے ایک رات اس سے محبت کی بھیک مانگی تھی اور جس اسے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ ایک نگاہ غلط انداز ہی ڈال لیتی۔ کیا وہ اس سے انتقام لے رہا واقعی سلطانہ نے اسے حقیر سمجھا تھا؟ یہ اور ایسے ہی نہ جانے کتنے سوالات اس کے ذہن میں ابھ رہے ڈوبتے رہے۔ ڈوبتے رہے ابھرتے رہے۔ اسی الجھن میں وہ اس روز پوری کیموئی کے پڑھا بھی نہ سکا۔

رات اس نے بڑی بے چینی میں گزاری۔ پھر اس کی کتنی ہی راتیں بے چینی میں کٹیں ایک روز وہ اسی بے چینی کے عالم میں علی احمد کے پاس پہنچا۔ یہ عذر پیش کیا کہ اس کی ماں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ وہ چند روز کے لیے گھر جانا چاہتا ہے۔

دوبھر: مشکل۔ کرب: دکھ۔ صراحی دار: مراد لمبی۔ تمکنت: رعب، شان۔

علی احمد نے اس سے صرف اتنا کہا کہ جس قدر جلد ہو سکے واپس آنے کی کوشش کرے۔ اس سلمان کو ۲۰ روپے زادراہ کے طور پر دئے اور ایک بار پھر جلد آنے کی تاکید کی۔
دوسرے روز سلمان رات کی ٹرین سے سفر پر روانہ ہو گیا۔

(۳)

ستمبر کی ایک دھندلی صبح کو سلمان چپ چاپ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں بوسیدہ اٹیچی لٹک رہا تھا۔ لباس ملگجا تھا اور سر کے خشک بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی وضع قطع سے کسی دواخانے کا ایجنٹ معلوم ہوتا تھا۔
اس کی آمد پر نہ کوئی ہلچل پیدا ہوئی نہ ہی کسی نے توجہ دی۔
گھر کا ہر فرد سرد مہری سے پیش آیا۔ باپ نے تو بات تک کرنا گوارا نہ کی۔ البتہ ماں کی مامتا بلک بلک کر اسے سینے سے لگا کر دیر تک روتی رہی۔ چند لمحے اس کے چاروں طرف ہجوم رہا۔ پھر ہر فرد خاموشی سے اپنے کام کاج میں مصروف ہو گیا۔ نہ کسی نے زیادہ بات چیت کی اور نہ اس پر گفت کی بوچھاڑ کی گئی۔
اس کے جھلسے ہوئے چہرے پر چھائی ہوئی ویرانی، دھنسی ہوئی آنکھوں اور ڈھیلے ڈھالے ملگجے کپڑوں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔
سلمان نے غور کیا کہ اس کی غیر حاضری میں گھر میں بہت سی تبدیلیاں آ گئی تھیں۔ باپ وقت سے ریٹائر ہو کر پنشن پر آ گیا تھا۔ اس نے لمبی ڈاڑھی رکھ لی تھی۔ وہ بڑی پابندی سے پانچوں نمازیں پڑھتا۔ سویرے تاروں کی چھاؤں میں اٹھ بیٹھتا اور دیر تک کلام پاک کی تلاوت کرتا۔ تہجد بھی پڑھتا۔ اس کا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزرتا تھا جہاں وہ خاموش بیٹھا حقہ گڑگڑایا دینی کتابوں کا مطالعہ کرتا۔
نماز مغرب کے بعد وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا اور صحن سے چپ چاپ گزرتا ہوا بیٹھک میں بیٹھ جاتا۔ پاس پڑوس سے اس کے کچھ ہم سن بوڑھے آ جاتے۔ وہ حقہ پیتے، پان چباتے اور

لغت: سرد مہری: بے مروتی، سنگدلی۔ ہم سن: ہم عمر۔

باتیں کرتے۔ ان کی گفتگو کا دائرہ بہت محدود ہوتا۔ کچھ بیتے دنوں کی یادیں کچھ ذاتی الجھنیں۔ کبھی دنیا کی بے ثباتی کا رونا۔ کبھی نئی پود کی بے راہ روی پر کڑھنا اور کبھی کبھار گرد و پیش کی زندگی پر سرسری سا تبصرہ۔

باپ کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اطمینان قلب حاصل ہے۔ اسے فخر تھا کہ اس نے ۳۶ سال تک بڑی خوش اسلوبی سے سرکاری ملازمت کی اور دیانت داری سے اپنے فرائض انجام دیئے۔ ہمیشہ افسران بالا کو خوش رکھا۔ اس کا ریکارڈ صاف ستھرا رہا۔ اسے سوا تین سو روپے ماہانہ پنشن مل رہی تھی۔ مزے سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اس نے اپنی تمام اولادوں کو اعلیٰ تعلیم دلا کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ اچھی زندگی گزار سکتے تھے۔ اسے دکھ تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کا بیٹا سلمان نالائق رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سلمان نائب تحصیل دار نہیں تو کم از کم سب انسپکٹر پولیس ہی بن جاتا۔

ماں اپنی عمر سے زیادہ بوڑھی لگتی تھی۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا۔ وہ بات بات پر رونا پیٹنا شروع کر دیتی۔ کبھی اس گھر پر اس کی حکمرانی تھی۔ مگر اب اسے کاٹھ کباڑ کی طرح ناکارہ قرار دے کر گھر کے ایک کونے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ ایک کوٹھری نما مختصر کمرے میں پڑی کھانسا کرتی، پان چبایا کرتی اور چھالیہ کترا کرتی۔ بلغم اور پان کی پیکوں سے اس نے دیواروں پر خوب گلکاریاں کی تھیں۔ وہ اپنی اولاد کو سرکش اور بدتمیز سمجھتی تھی اور اولاد اسے جاہل اور کوڑھ مغز قرار دیتی تھی۔ گھر میں جب کوئی مہمان آتا تو اس کے کمرے میں باہر سے تالا لگا دیا جاتا اس لیے کہ وہ بڑی بے سرپا باتیں کرتی تھی۔ اس کے لہجے سے نفاست اور شائستگی کے بجائے پھوہڑپن ٹپکتا تھا۔ وہ باتوں کی دھن میں اکثر ایسی باتیں کہہ جاتی جو بہت معیوب ہوتی تھیں اور جن سے گھر کے وہ راز افشا ہو جاتے جن کو سات پردوں میں چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

لیکن یہی ایک ایسا وقت ہوتا جب وہ اپنی اولاد سے انتقام لے سکتی تھی۔ وہ اپنا ملگجا لباس پہنے جوتیاں گھسیٹتی سڑ سڑ کرتی ادبدا کے مہمانوں کے سامنے آ جاتی۔ دونوں لڑکیوں اور بہو کے چہرے سفید پڑ جاتے۔ وہ دانت کٹکٹا کر اسے گھورتیں تاکہ وہ جلد سے جلد نظروں سے دور ہو جائے۔ لیکن وہ سب کچھ نظر انداز کر کے عین مہمان کے سامنے آ کر بیٹھ جاتی اور دنیا جہان کے قضیئے چھیڑ دیتی۔ بعد

بے ثباتی: ناپائیداری۔ پود: نسل۔ اطمینان قلب: دلی سکون۔ گل کاریاں: پھول بوٹے، نقش و نگار۔ کوڑھ مغز: بے عقل۔ بے مرقا فضول۔ پھوہڑپن: اجڈپن، جہالت۔ معیوب: ناپسندیدہ۔ افشا: ظاہر۔ قضیے: جھگڑے۔

گھر کے اندر کہرام مچتا۔ ہر طرف سے اس پر لتاڑ پڑتی۔ وہ چیخ چیخ کر روتی۔ کوسنے دیتی اور اپنی بہن کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلے جانے کی دھمکی دیتی۔ پھر ٹرنکوں اور صندوقوں سے کپڑے نکلتے۔ بستر بندھتا اور اسٹیشن جانے کے لیے تانگا بلایا جاتا۔ یہ گویا سارے ڈرامے کا نقطہ عروج ہوتا۔ جانے والی ماں ہر ایک کے گلے لگ کر سسکیاں بھرتی اور یہیں سے حالات معمول پر آنا شروع ہو جاتے۔ سارا معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔

جب بھی گھر میں مہمان آتے تو ان کے جانے کے بعد اکثر یہی ڈراما ہوتا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مہمانوں کی آمد سے پہلے ماں کے ڈھیروں مکھن لگایا جاتا۔ سو سو طرح سے اس کی خوشامد ہوتی۔ بار بار منتیں دی جاتیں اور منت سماجت کر کے اسے کمرے میں بند کر دیا جاتا۔ مگر یہ اس کی مرضی پر منحصر تھا۔ اس لیے کہ وہ کمرے کے اندر سے بھی شور مچا سکتی تھی اور اس کا یہ اقدام بہت ہی خطرناک ثابت ہوتا۔ چنانچہ کبھی تو ہنگامہ ٹل جاتا اور کبھی پاس پڑوس والوں کو بھی مہمانوں کی آمد کا پتہ چل جاتا۔

ماں کو سب سے زیادہ شکایت اپنی چھوٹی بیٹی سے تھی جس کے سپرد ان دنوں خانہ داری کا سارا نظام و انصرام تھا۔ یہ ذمہ داری سنبھال کر اس نے ماں کے حق پر ڈاکہ ڈالا تھا جسے وہ کسی قیمت پر برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس حق سے محروم ہونے کے بعد اس کی حیثیت گھر میں ملازموں سے بھی گئی تھی۔ اب چھوٹی بیٹی کی حکمرانی تھی۔ وہ انٹر میجیٹ کے فائنل ائر میں تھی۔ اسے جدید فیشن کے بھڑکدار لباس، میک اپ اور اپنی استانیوں کو نت نئے تحفے دینے کا شوق تھا۔ اس فضول خرچی کا اثر گھر کے بجٹ پر پڑتا اور ہمیشہ نزلہ ماں کے پاندان پر گرتا جو اس کا مونس تنہائی رہ گیا تھا۔ وہ ان باتوں سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اسے صرف پان سے دلچسپی تھی اور جب پان ملنے میں بھی دیر پیش آتی تو وہ شعلے کی مانند بھڑک اٹھتی۔

سلمان کی بڑی بہن لاہور کے کسی کالج میں لیکچرار تھی اور ان دنوں چھٹیوں پر گھر آئی ہوئی تھی۔ اس نے فلسفے میں ایم اے کیا تھا۔ لیکن وہ خود ایک ہی فلسفے میں یقین رکھتی تھی۔ اور وہ فلسفہ یہ تھا کہ کسی گزیٹیڈ افسر سے شادی ہو جائے۔ اسی انتظار میں اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ میک اپ کے باوجود آنکھوں کے نیچے ہلکی ہلکی جھریاں صاف نظر آتی تھیں۔ وہ گھر میں کسی سے بات چیت کرتی اور سب پر اس طرح حکم چلاتی گویا وہ اس کے تابعدار ہوں۔

ا ہوکا: ملامت کرنا۔ بھڑکدار: چٹکیلے۔ نزلہ گرنا: شامت آنا۔ مونس تنہائی: تنہائی کا ساتھی۔

گزیٹیڈ افسر شوہر سے مایوس ہو کر اب وہ غیر ملکی اسکالرشپ کے لیے کوشاں تھی۔ ان دنوں اس پر یہی دھن سوار تھی اور اسے حاصل کرنے کے لیے اس نے وزارت تعلیم کے ایک بڑے افسر کے بنگلے کے اتنے طواف کیے تھے کہ اس کے متعلق طرح طرح کے اسکینڈل مشہور ہو گئے۔

منجھلا بھائی نہر کے محکمے میں ملازم تھا۔ وہ سر تا پا تصنع تھا۔ اس پر مغربیت دیوانگی کی حد تک سوار تھی۔ اس کی بیوی گریجویٹ تھی۔ لہٰذا وہ اور بھی زیادہ انگریز بنتا جا رہا تھا۔ وہ سویرے اٹھ کر بیڈ ٹی پیتا۔ ناشتے کے ساتھ اخبار کا مطالعہ کرتا اور اخبار میں ہمیشہ ایسی خبریں تلاش کرنے کی کوشش کرتا جن میں ان افسروں کا ذکر ہوتا جن سے اس کی شناسائی تھی۔ دفتر جاتے وقت بیوی اسے دروازے تک چھوڑنے جاتی تھی جہاں وہ اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا اور بائی بائی کہتا ہوا چلا جاتا۔ بیوی کو ہمیشہ ڈارلنگ کہتا۔ ہالی وڈ کی فلمیں دیکھ دیکھ کر نئے نئے انداز کے لباس پہنتا اور بڑا عجیب و غریب نظر آتا۔

وہ گھر میں روزانہ نت نئی تبدیلیاں کرتا رہتا۔ ایک روز پیتل کی ایک گھنٹی لے آیا جو کھانے کی میز پر رکھ دی گئی۔ ناشتے اور کھانے کے وقت اسے بجا کر باقاعدہ اعلان کیا جاتا کبھی بیوی کے لیے جمناسٹیم کا سامان لے آتا۔ سویرے بہت تڑکے اٹھتا اور اپنی نگرانی میں بیوی سے ورزش کرواتا۔ اسے طرح طرح کی ہدایتیں دیتا۔ عام طور پر وہ اپنا ہر تجربہ بیوی پر آزماتا تھا۔ جب وہ موٹی ہو جاتی تو ڈائیٹنگ کرواتا۔ دبلی ہو جاتی تو مکھن اور دودھ کی مقدار میں ناپ ناپ کر اضافہ کرتا۔ وہ اپنے بچوں سے ہمیشہ انگریزی میں بات چیت کرتا۔ اگر کبھی ان کی زبان سے اردو کا لفظ سن لیتا تو آگ بگولہ ہو جاتا۔ اس کے دو بچے تھے جو بہت کم سن تھے مگر انہیں کانونٹ میں داخل کرانے کے لیے اس نے ابھی سے کوشش شروع کر دی تھی۔

وہ کوئی بڑا عہدے دار نہیں تھا۔ آمدنی کم تھی اور اخراجات بڑھتے جا رہے تھے جنہیں پورا کرنے کے لیے وہ رشوت خوری کے نت نئے طریقے ایجاد کرتا تھا۔ اس کی صرف ایک ہی خواہش تھی اور وہ یہ تھی کہ اسے بڑا آدمی سمجھا جائے۔ لیکن ماں اسے بڑا آدمی سمجھنے کے بجائے نرا کاٹھ کا الو سمجھتی تھی جس کا انتقام وہ اس طرح لیتا کہ اکثر رات کو پیئر کا ایک گلاس چڑھاتا اور نشے کی ترنگ میں ماں کو ڈانٹتا پھٹکارتا۔

دھن: جنون۔ طواف کرنا: چکر لگانا۔ تصنع: بناوٹ، دکھاوا۔ آگ بگولہ ہونا: نہایت غصہ میں آنا۔ کاٹھ کا الو: بیوقوف، احمق۔

چھوٹا بھائی بی اے کر چکا تھا۔ وہ تمام وقت پڑھنے میں جٹا رہتا۔ اس کی زندگی کا ایک ہی مشن تھا
ی طرح سی ایس پی بن جائے۔ شاندار بنگلہ، جھلکتی کار، اردلی اور سر کہنے والے ماتحتوں کی پلٹن۔
اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اپنی بینائی خراب کر چکا تھا۔ وہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک
ا۔
ے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ وہ ہر وقت اپنے کمرے میں کتابوں پر جھکا
ر آتا۔

❀ ❀ ❀

سلمان کئی برس بعد آیا تھا اور ان کئی برسوں میں اتنی بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں کہ وہ اپنے
ر میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگا۔
بظاہر اس کے بھائی بہنوں کے پروگرام مختلف تھے مگر سب کی منزل ایک ہی تھی۔ وہ اس
ی تک پہنچ جانا چاہتے تھے جس پر چڑھ کر وہ اوپر کے طبقے میں شامل ہو سکتے تھے۔ مگر وہ خلا میں
ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے سر نیچے اور ٹانگیں اوپر تھیں تاکہ نیچے نہ دیکھ سکیں، صرف بلندی کو
یں۔ وہ نیچے اترنا نہیں چاہتے تھے اور اوپر پہنچنا ان کے بس میں نہ تھا۔ انہیں ایک ایسے سہارے
رورت تھی جو ان کا ہاتھ پکڑ کر اوپر کھینچ لے۔
سلمان اس لیے گھر آیا تھا کہ اس کی صحت کچھ سنبھل جائے گی اور جس ذہنی انتشار میں مبتلا تھا
ا کمی آجائے گی۔ مگر ہفتہ بھی نہ گزرا تھا کہ ٹائی فائیڈ میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا بیمار پڑا کہ ہفتوں بستر
ا۔ یہ اس کی زندگی کا بڑا اذیت ناک دور تھا اس کے بھائی بہنوں کا رویہ بڑا افسوس ناک تھا۔
ا کے قریب آکر نہ پھٹکتا۔ وہ اس سے اس طرح کتراتے جیسے وہ مجسم ٹائی فائیڈ کی بلا بن گیا تھا
ہ آتے ہی ان سے چمٹ جاتی۔
سب مل کر قہقہے لگاتے۔ فلموں پر تبصرے کرتے۔ لباسوں کے نئے ڈیزائنوں پر بحث
مگر کوئی اس کی علالت کے متعلق بات بھی نہ کرتا۔ وہ بخار میں بے سدھ پڑا تپتا رہتا۔ بے
ے کروٹیں بدلا کرتا۔ ایک ایک چیز کو ترسا کرتا۔ منجھلے بھائی کو تو اپنی نت نئی مصروفیات کے

گرگٹ رہتا۔ اردلی: سرکار کی طرف سے ملنے والا نوکر۔ معلق: لٹکے ہوئے۔ انتشار: پریشانی، فکر۔ اذیت ناک: تکلیف دہ۔ دور:

باعث اس کے متعلق سوچنے تک کی فرصت نہیں تھی۔ چھوٹا بھائی سی ایس پی بننے کی تیاری میں غرق تھا۔ وہ سلمان کے لیے صرف ایک بار ڈاکٹر کے پاس گیا تھا اور واپس آ کر اس قدر احسان جتایا کہ وہ دوبارہ اس سے کچھ نہ کہہ سکا۔ بڑی بہن کبھی کبھار بھولے بھٹکے اس کی طرف آ جاتی۔ مگر وہ بھی اس طرح کہ ناک پر رومال رکھ کر دروازے کی دہلیز ہی پر ٹھٹک جاتی۔ کھڑے کھڑے اشاروں سے اس کی طبیعت کا حال پوچھتی اور الٹے قدموں واپس چلی جاتی۔

ایک ماں کی مامتا تھی جو ہر وقت بے چین رہتی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھی رہتی اور اکثر ساری رات آنکھوں میں کاٹ دیتی۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وقت پر دوا دیتی۔ اس کا سر دباتی۔ بخار کی شدت ہوتی تو اس کے تلوے سہلاتی۔ پیشانی پر کپڑا بھگو کر رکھتی۔ ہر طرح اسے تسلی دیتی۔ کبھی کبھی وہ اپنی بے کسی پر بے قرار ہو کر آب دیدہ ہو جاتا تو وہ اسے سمجھاتی اور سمجھاتے سمجھاتے خود بھی رونے لگتی۔

❁ ❁ ❁

مہینے کی آخری تاریخیں تھیں۔ گھر کے سارے اخراجات قرض پر چل رہے تھے۔ سلمان کے لیے دوا بھی قرض پر آ رہی تھی۔

وہ موسمبی کا رس پینا چاہتا تھا۔ طویل علالت نے اسے بچوں کی طرح ضدی بنا دیا تھا۔ وہ ماں سے بار بار موسمبیاں منگوانے کے لیے اصرار کر رہا تھا۔ ماں پہلے تو ٹالتی رہی پھر اپنی مجبوری پر پڑی اور آنسو پونچھتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

سلمان کو اپنی غلطی کا اچانک شدت کے ساتھ احساس ہوا۔

اس کے کمرے کے سامنے صحن تھا اور صحن کے مشرقی کونے پر اس کے منجھلے بھائی کا کمرہ تھا۔ کھلی ہوئی کھڑکی سے صاف نظر آتا تھا۔

لیٹے لیٹے سلمان کی نظر منجھلے بھائی کے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اس نے دیکھا، کمرے میں میز پر بہت سے تازہ پھل رکھے تھے اور اس کا بھائی اونچی آواز سے بول رہا تھا۔ وہ بیوی کے ساتھ اپنے ایک بیمار افسر کی عیادت کے لیے اسپتال جا رہا تھا اور یہ پھل، جن میں سرخ سرخ موسمبیاں بھی شامل تھیں، اسے پیش کرنے کے لیے بطور خاص منگوائے گئے تھے۔ سلمان نے سب کچھ خاموش

ٹھٹکنا: ذرا دیر کیلئے رکنا۔ آبدیدہ ہونا: آنکھوں میں آنسو آنا۔

نظروں سے دیکھا اور کسی اندرونی چوٹ سے بلبلا کر رہ گیا۔

ایک رات بخار کی شدت سے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کا بدن انگیٹھی کی طرح سلگ رہا تھا۔ پیاس کی شدت سے حلق خشک پڑ گیا تھا۔ اس نے کئی بار ماں کو اپنی نحیف آواز سے پکارا مگر اس کی ماں کو بھی بخار تھا کوئی تشویش ناک مرض نہ تھا۔ مسلسل شب بیداری سے بیمار پڑ گئی تھی اور اس وقت اس قدر گہری نیند سو رہی تھی کہ اسے کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ سلمان کچھ دیر تک آوازیں لگاتا رہا پھر ہمت کر کے پلنگ سے نیچے اترا گھر پر سناٹا چھایا تھا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ڈوبتے چاند کی زرد روشنی چھت کی منڈیر پر جھلک رہی تھی۔ ہوا سرد تھی اور آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ سلمان کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے چلتا ہوا کمرے سے باہر آ گیا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے صحن عبور کیا۔ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ کر زور زور سے ہانپنے لگا جہاں کھانے کی چیزیں تھی۔ کمرے میں دھندلی روشنی تھی اور اس روشنی میں اس نے میز پر رکھا ہوا تھرماس دیکھ لیا۔

چند لمحوں تک وہ دروازے کا سہارا لیے ہانپتا رہا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے رینگ رہے تھے اور حلق میں پیاس کی شدت سے کانٹے چبھ رہے تھے۔ وہ دیوار کے سہارے سہارے چلتا ہوا میز کے قریب پہنچا۔ تھرماس کھولا۔ اس میں سے برف کا ایک ٹکڑا نکالا۔ اچانک اس کے پیر زور زور سے ہلنے لگے اور آنکھوں کے سامنے کالے کالے پردے لہرانے لگے۔ وہ چکرا کر وہیں گر پڑا۔

اسے نہیں معلوم وہ کب تک کمرے کے سرد فرش پر پڑا رہا۔ کب وہ اپنے بستر پر آیا؟ کون اٹھا کر لایا؟ اسے کچھ خبر نہ ہوئی۔

ہوش آیا تو سب سے پہلی آواز جو اس نے سنی وہ اس کی بھاوج کی تھی۔ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی تھی۔

"تھرماس گر کر بالکل تباہ ہو گیا۔ پچھلے ہی مہینے تو خریدا تھا۔"

اس کے شوہر نے صرف اس قدر کہا۔ "ڈارلنگ! تم اس طرح پریشان ہو کر اپنی صحت خراب کرو گی۔ میں دوسرا تھرماس لے آؤں گا۔"

مگر وہ دیر تک غصے سے بڑبڑاتی رہی اور سلمان بستر پر پڑا اس کی آواز سنتا رہا۔ یہ اور ایسے ہی ستم اس نے بیماری کے دنوں میں اپنے دل پر کھائے اور ہر بار دکھ سے تڑپ کر رہ گیا۔

ستم: ظلم، بہت برا سلوک۔ نحیف: کمزور۔

❁ ❁ ❁

باپ فجر کی نماز مسجد میں پڑھتا تھا۔ واپسی پر سلمان کے کمرے میں بھی آتا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ جھک کر سلمان کی پیشانی چھوتا۔ کلائی تھام کر نبض دیکھتا۔ مگر زبان سے ایک لفظ نہ نکالتا۔ اس کے سرہانے کھڑا زیر لب کوئی دعا پڑھتا رہتا۔

جب بھی وہ آتا، سلمان کی آنکھ کھل جاتی۔ اس وقت اسے اپنے باپ کے چہرے پر ایک مقدس نور نظر آتا۔ اس کی سفید ڈاڑھی آہستہ آہستہ حرکت کرتی اور آنکھوں میں بے بسی اور مظلومیت جھلکتی۔

سلمان خاموش لیٹا سوچتا رہتا کہ یہ بوڑھا کس قدر بدقسمت ہے۔ اس نے اپنی ساری جوانی موٹی موٹی فائلوں میں سر کھپاتے گزار دی۔ افسران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے دس دس بارہ بارہ گھنٹے دفتر میں کاٹے۔ ہمیشہ موٹا جھوٹا پہنا اور روکھا سوکھا کھایا۔ نہ کبھی بالا خانے پر جانے کی اسے توفیق ہوئی نہ اسے مے خانے سے نکلتے دیکھا گیا۔ نہ کسی کی بانکی چتون نے اسے گھائل کیا اور نہ سہانی راتوں میں اس کی جوانی نے انگڑائیاں لیں۔ اس نے زائد سے زائد مشقت کی۔ کم سے کم خرچ کیا اور زائد سے زائد پس انداز کیا۔ اور یہ سب کچھ اس نے صرف اس لیے کیا کہ اس کی اولاد کا مستقبل روشن ہو جائے۔

وہ ہزاروں روپے جو اس نے اپنی خوشیاں نیلام کر کے کمائے تھے، اولاد کی تعلیم پر لگا دیے۔ اور اس کی تعلیم یافتہ اولاد اور ان پڑھ نیاز میں کوئی فرق نہیں تھا۔ سلمان سوچا کرتا کہ یہ بدقسمت بوڑھا کس قدر احمق ہے۔ اس سے زیادہ سمجھ دار تو نیاز کا باپ تھا جس نے اسے کوئی تعلیم نہیں دلائی۔ اپنی گاڑھی کمائی کا ایک پیسہ اس پر صرف نہیں کیا۔ نیاز کو بھی اس سم سم کی تلاش تھی جس کی تلاش میں اس کے بہن بھائی سرگرداں تھے۔ لیکن نیاز نے اس سم سم کا سراغ لگا لیا تھا۔ ان پڑھ کباڑیا تین گریجویٹوں سے بازی لے گیا۔ کوٹھی، کار اور بینک بیلنس۔ جیت کے تینوں کارڈ اس کے پاس تھے۔ وہ بڑا آدمی بن چکا تھا۔ اور وہ تینوں ابھی تک جیت کے ان تینوں کارڈوں کے خواب ہی دیکھ رہے تھے۔

زیر لب: منہ ہی منہ میں۔ بالا خانہ: رنڈی کا کوٹھا۔ مے خانہ: شراب خانہ۔ بانکی چتون: ترچھی نظر۔ پس انداز: بچت۔ گاڑھی کمائی: محنت سے حاصل کی گئی دولت۔ سرگرداں: مصروف۔

سلمان کو نیاز سے نفرت تھی اور اپنے بہن بھائیوں سے بھی۔ نیاز نے اسے اس لیے نظر
رت سے دیکھا تھا کہ وہ قیمتی سگریٹ نہیں پی رہا تھا۔ شان دار سوٹ نہیں پہنے تھا۔ اس کے پاس
نہیں تھی۔ وہ مفلوک الحال انسانوں کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی سنوارنا چاہتا تھا۔ اور
ے بہن بھائی اس لیے اسے حقیر اور کم تر سمجھتے تھے کہ اس نے کوئی عہدہ کوئی منصب ہتھیانے
شش نہیں کی۔ بینک بیلنس کیوں نہ بڑھایا؟ ان کے نزدیک عوام کی خدمت محض مسخرا پن تھا،
راحماقت تھی۔ اس لیے کہ وہ بلندی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں مطلق احساس نہ تھا کہ
کروڑوں ننگے بھوکے، کیڑے مکوڑوں کی مانند رینگ رہے ہیں جو ان ہی کی طرح انسان ہیں۔
کی خوشیاں اور غم ان سے مختلف نہیں ہیں۔

بیماری کے دنوں میں سلمان مسلسل ایسی ہی باتیں سوچتا رہا اور ان کا نفسیاتی رد عمل یہ ہوا کہ وہ
ماندہ اور پریشان حال انسانوں کا دکھ درد بھول کر اپنے بہن بھائیوں سے انتقام لینے کی سوچنے لگا۔
انچا دکھانے کا پروگرام بنانے لگا۔

وہ اپنی تحقیر اور ذلت کا ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔

❀ ❀ ❀

صحت یاب ہونے کے بعد سلمان نے فلک پیما کے ہیڈ کوارٹر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور یہ
چنے لگا کہ وہ کیا کرے؟

انہیں دنوں ماں نے اصرار کرنا شروع کر دیا کہ وہ شادی کر لے۔ ماں کی خواہش تھی کہ اس کی
لائی میں وہ اپنا گھر بسا لے۔

یہ پروگرام دراصل اس کے باپ کا تھا اور بیوی کے ذریعے اس نے سلمان تک پہنچایا تھا۔
طبقے کے ایک عام باپ کی طرح اسے بھی سلمان کو راہ راست پر لانے کا ایک ہی مجرب نسخہ
ظر آیا اور وہ شادی کا پروگرام تھا۔

سلمان نے صاف انکار کر دیا۔

مگر جب ماں نے بتایا کہ لڑکی کا چچا صوبائی اسمبلی کا ممبر ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ چچا نے
کی طرح اسے پالا پوسا ہے۔ وہ پانچ ہزار روپیہ نقد دے گا اور اس کے علاوہ ملازمت بھی دلوا دے

لطائل: بدحال، خستہ حال۔ مسخرا پن: دل لگی۔ پس ماندہ: غریب۔ تحقیر: بے عزتی۔

گا۔ یہ سن کر سلمان کو سنجیدگی سے غور کرنا پڑا۔

اس نے سوچا زندگی میں آگے بڑھنے اور شادمانی و کامرانی حاصل کرنے کے تمام دروازے بند ہو چکے ہیں۔ صرف چور دروازے سے اندر داخل ہوا جاسکتا ہے اور صوبائی اسمبلی کے ممبر کے پاس اس چور دروازے کی کنجی ضرور ہوگی۔ چنانچہ چند روز تک سوچ بچار کرنے کے بعد وہ شادی پر رضامند ہو گیا۔

شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

اس کے باپ نے روپیہ قرض لے کر خرچ کیا۔ اس لیے کہ وہ صوبائی اسمبلی کے ایک ممبر کا سمدھی بننے جارہا تھا۔

شادی میں شہر کے اعلیٰ حکام اور معززین کے علاوہ تین وزیر بھی شریک ہوئے۔ لہٰذا تمام مقامی اخبارات میں شادی کی تقریب کی تصاویر بھی شائع ہوئیں جن میں سلمان کے بجائے وزیر دولھا معلوم ہوتے تھے۔ بلکہ ایک اخبار نے، جسے سرکاری اشتہارات کی اشد ضرورت تھی، دولھا کو بھی نکال دیا اور تصویر میں صرف وزیروں ہی کو رہنے دیا جس میں وزیر اطلاعات کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا تھا۔

سلمان کو شب عروسی ہی پر اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیوی سیدھی سادھی گھریلو لڑکی ہے۔ اس نے میٹرک تک تعلیم پائی تھی۔ اس کا ذہن گویا گیلی مٹی تھا جسے وہ کمہار کی طرح جس سانچے میں چاہتا ڈھال سکتا تھا۔

وہ اس کی توقع سے زیادہ دل کش اور معصوم نکلی۔ وہ خوش تھا کہ اس نے گھاٹے کا سودا نہیں کیا۔ جہیز کے علاوہ پانچ ہزار روپے نقد ملے تھے اور ملازمت کے لیے چچا سسر نے حسب وعدہ کوشش شروع کر دی تھی۔

شادی کے تیسرے ہی ہفتے سسر کا خط آیا کہ فوراً کراچی پہنچو۔ ملازمت کا بندوبست ہو گیا ہے۔ سلمان نے بیوی کو گھر پر چھوڑا اور اسی روز پہلی ٹرین سے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

شادمانی و کامرانی: خوشی و کامیابی۔ سمدھی: دلہن اور دولہا کے باپ آپس میں سمدھی ہوتے ہیں۔ شب عروسی: شادی کی پہلی رات۔